مخطوطہ کی اہمیت

ڈاکٹر محمد میاں صدیقی☆

کوئی زبان، علم، یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے؟ اس کی عکاسی اور نشان دہی اس کی کتابوں اور علمی و تحقیقی کام سے ہوتی ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں درحقیقت وہ صحیفے ہیں جن میں علوم و فنون، اور ان کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستانیں رقم ہیں۔ معاشرہ، مستقبل میں ترقی و کمال کی کن بلندیوں سے آشنا ہو گا۔ اس کی بشارت بھی کتابوں کے اوراق ہی میں ملتی ہے۔

مسلمانوں کو اس بات پر فخر ہے اور بجا فخر ہے کہ ان کی کتاب ہدایت کا آغاز ہی تحصیل علم کی ترغیب سے ہوا۔ اقرا باسم ربک الذی خلق،اور اقرا و ربک الاکرم الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم۔

جس رسول پر یہ کتاب ہدایت اتاری گئی اس کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب و حکمت کو شامل کیا گیا۔ ارشاد ربانی ہے "یعلمھم الکتاب والحکمۃ" رسول مکرمؐ کو خاص طور پر یہ دعا تلقین کی گئی۔رب زدنی علما۔ اور پھر خود زبان نبوت و رسالت نے اپنی امت سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"اطلبوا العلم من المھد الی اللحد"

ان محرکات کا لازمی نتیجہ تھا کہ اس دین کے ماننے والوں کا طرہ امتیاز تحصیل علم اور اشاعت علم ہو اور ایسا ہی ہوا۔

انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں مسلمانوں کے دینی کردار کے ساتھ ان کے تہذیبی اور علمی کردار کا ذکر باہم لازم و ملزوم ہیں۔ مسلمان جہاں بھی حکمران رہے بلکہ یوں کہیئے کہ جہاں بھی رہے، وہاں کی تہذیب و تمدن پر انہوں نے گہرا اثر ڈالا۔ ان کے علمی اور ثقافتی اثرات میں سب سے نمایاں کتب خانے تھے۔ مسلمان اس حقیقت کے سب سے زیادہ شناسا تھے کہ تہذیب و تمدن،

ادارہ علوم اسلامیہ و عربی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اور علوم و فنون کی ترقی کے لئے تعلیم و تعلم کا مربوط نظام ضروری ہے اور اس نظام کو قائم رکھنے کے لئے کتب خانوں کا وجود ناگزیر ہے۔ تعلیم و تعلم اور مطالعہ کے لئے کتابوں کی فراہمی اور ان کے تحفظ کا خیال دنیا کی تمام زندہ قوموں میں قدیم زمانے سے موجود تھا۔ لیکن مسلمانوں کے لئے اس کا محرک تمدنی ضروریات سے زیادہ دینی تھا۔

مسلمان دینی طور پر اس امر کے پابند تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال قلمبند کریں اور انہیں تحریری شکل میں لاکر آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیں کیونکہ کتاب اللہ کے ساتھ انہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا بھی حکم دیا گیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی حیات طیبہ ہی کے دوران بعض صحابہ کرام نے آپ کے ارشادات کو لکھ کر صحیفوں کی صورت میں محفوظ کر لیا تھا۔ عبداللہ بن مسعود' جابر بن عبداللہ' علی بن ابی طالب' عبداللہ بن عمرو بن العاص' معاذ بن جبل (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور بعض دوسرے صحابہ کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے حضور کے اقوال و افعال کو لکھ لیا تھا اور بعض نے یہ لکھا ہوا حضور کو سنا کر ان کی تصدیق بھی حاصل کر لی تھی۔ ایسے صحابہ کی تعداد انتالیس تھی۔ عہد صحابہ کے بعد اہل علم نے انہی مجموعوں کی نقلیں کیں اور اس طرح عہد رسالت مآب کے یہ اولین مخطوطے آئندہ نہ صرف حدیث کے مجموعوں کے لئے بلکہ دینی موضوعات پر دوسری کتابوں کی تصنیف و تالیف کے لئے بھی بنیاد بنے۔

اسلامی ریاست کے مختلف حصوں میں معلمین کے تقرر کی ابتداء تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے ہو گئی تھی لیکن کتب خانوں کے قیام کی ابتداء حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی' جب انہوں نے قرآن حکیم کے مختلف نسخے ایک قرات اور ایک تلفظ کے مطابق لکھوا کر اسلامی ریاست کے مختلف شہروں میں رکھوائے اور لوگوں سے کہا کہ وہ انہی سے کلی یا جزوی طور پر قرآن حکیم کی نقول حاصل کریں۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شہروں کی بڑی بڑی مساجد میں کتب خانے قائم ہو گئے۔ حضرت معاویہ کے پوتے خالد الحکیم نے جو علم کیمیا کا مستند عالم تھا دمشق میں اپنا ذاتی کتب خانہ قائم کیا۔ اس کتب خانے کو عام لوگوں کے لئے کھول دیا اور انہیں ترغیب دی کہ وہ اس میں آکر مسودات کا مطالعہ بھی کریں اور ان کی نقول بھی تیار کریں۔ خالد نے سریانی اور یونانی زبانوں کی بعض کتابوں کے عربی زبان میں تراجم

کرائے۔ کیمیا' طب اور فلکیات کے موضوع پر گراں قدر کتابوں کے مخطوطے اس کی لائبریری کی زینت بن گئے۔

بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے بغداد' کوفہ' بصرہ' دمشق' قاہرہ' قرطبہ' بخارا' ہرات اور پھر برصغیر ہند میں دہلی' لکھنؤ' حیدر آباد' پٹنہ' رامپور' بھوپال' لاہور' ملتان' اور ٹھٹہ اسلامی کتابوں کے بڑے مراکز بن گئے۔

ابتدائی صدیوں میں صورت حال آج سے بہت مختلف تھی۔ اب تو طباعت اتنی عام ہو گئی کہ بہت کم کوئی کتاب دیر تک مسودے اور مخطوطے کی صورت میں رہتی ہے۔ تصنیف و تالیف کے چند سال بعد عموماً" طبع ہو جاتی ہے' اور پھر اس کے ضائع ہونے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلامی عہد کے ابتدائی دور میں بلکہ صدیوں تک طباعت کی کوئی صورت نہ تھی' کتابیں مسودات کی صورت میں محفوظ رہتی تھیں۔ اس وقت جبکہ کسی کتاب کے ایک یا دو' یا زیادہ سے زیادہ چند مخطوطے ہوتے تھے' یہ کہنا کہ فلاں کتب خانے میں بیس ہزار کتابیں تھیں' آج کے دور میں یہ کہہ دینے کے مترادف ہے کہ فلاح کتب خانے میں دو لاکھ کتابیں ہیں۔ اسی لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ تصنیف و تالیف اور تعلیم و تعلم کے میدان میں دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکی اور اس دعوے میں مبالغہ کی کوئی آمیزش نہیں ہے۔

مسلمانوں کی ابتدائی صدیوں میں کتابیں صرف مخطوطات کی شکل میں ہوتی تھیں اس لئے صورت حال یہ تھی کہ ایک مخطوطہ کا ضائع ہو جانا پوری کتاب اور تصنیف کا ضائع ہو جانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جو غیر مسلم قومیں مسلمانوں پر غالب آئیں اور انہوں نے مسلمان حکومتوں اور علاقوں کو فتح کیا' انہوں نے مسلمانوں کی دوسری املاک کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا ان کے کتب خانوں کو پہنچایا۔ انہوں نے کتابوں کو انسانوں سے بھی زیادہ اہم سمجھا۔ آبادیوں کا قتل عام بعد میں کیا' پہلے اسلامی کتب خانے لوٹے اور ان میں موجود ہزاروں قیمتی مسودات کو جو مختلف علوم و فنون پر مشتمل تھے' جلایا یا دریا برد کیا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا سب سے موثر طریقہ یہی ہے کہ انہیں ان کی علمی اور ثقافتی میراث سے محروم کر دیا جائے۔ پچھلی نسل نے علم اور فن کے میدان میں جو گرانقدر کام کیا ہے وہ آنے والی نسل تک نہ پہنچے۔

مسلمانوں نے ابتدائی صدیوں میں جب مغرب جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا' دینی علوم کے علاوہ دوسرے علوم پر بھی اتنا تصنیفی کام کیا کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم اس کی ہم سری

کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

تصنیف و تالیف اور مطالعہ کتب کا ذوق صرف روایتی اہل علم تک محدود نہ تھا' زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد علمی افادے اور استفادے میں مصروف رہتے تھے۔

آج کے جمہوری دور میں شاید لوگوں کا ذہن اس بات کو قبول نہ کرے کہ سربراہ حکومت بھی ایک عالم اور محقق کی طرح مطالعہ کر سکتا ہے مگر ان حکومتوں میں یہ بات انوکھی نہ تھی جن کا نظام اور ڈھانچہ اسلامی تھا' یا کم سے کم غیر جمہوری تھا۔ بنو عباس کے ابتدائی دور میں بیت الحکمت کے نام سے جو کتب خانہ قائم کیا اس میں کتابوں کی تعداد دس لاکھ تھی۔

اس وقت دس لاکھ کتابوں کا مطلب یہ تھا کہ دس لاکھ مخطوطے ہیں۔ آج علمی اور ثقافتی ترقی کے بلند بانگ دعوے ہیں مگر حقیقت کچھ بھی نہیں۔ بنو عباس کے دور کے وسائل اور آج کے وسائل کا موازنہ کیا جائے تو آج پاکستان جیسے عظیم مسلمان ملک کی کسی ایک سرکاری یا مرکزی لائبریری میں کم از کم پچاس لاکھ کتابیں ہونی چاہئیں تھیں مگر گزشتہ پچاس برس میں حکومت ایک بھی قابل فخر لائبریری قائم نہیں کر سکی۔

طباعت اور نشرواشاعت کے ذرائع وسائل میں غیر معمولی ترقی سے جہاں بہت سے فوائد ہوئے۔ اہل علم کی تصانیف اور علمی کاوشیں ضائع ہونے سے بچ گئیں' وہاں میرے نقطہ نظر سے ایک نقصان بھی ہوا اور وہ یہ کہ مسودات اور مخطوطات کی اہمیت کم ہو گئی۔ موجودہ صدی میں اگر صرف برصغیر کا جائزہ لیں تو یہ تلخ حقیقت سامنے آئے گی کہ یہاں کے اہم اہل علم نے بے شمار موضوعات پر مختصر اور ضخیم کتابیں لکھیں۔ عربی' فارسی اور انگریزی زبانوں سے ترجمے کئے۔ مگر بہت کم کتابوں کے مسودات محفوظ ہیں۔ ملک کی لائبریریوں میں جہاں جہاں مخطوطات ہیں وہاں تقریباً تمام مخطوطات کم ازکم دو سو سال قبل کے ہیں' میں ان تمہیدی کلمات کے بعد اپنی اس گفتگو میں یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے کی اہمیت طبع ہو جانے کے باوجود کس حد تک ہے۔

مصنف کا اپنا لکھا ہوا مسودہ اگر محفوظ ہے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں حذف اور ترمیم و اضافہ ممکن نہیں ہو گا۔ اس صورت حال سے ہم اکثر دوچار ہوتے رہتے ہیں کہ ایک ہی کتاب کے مختلف نسخوں میں فرق ہوتا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں بعض عبارتیں موجود ہیں لیکن دوسرے ایڈیشن میں موجود نہیں ہیں۔ مصنف اگر زندہ نہ ہو تو پھر اس کی تصدیق ممکن نہیں ہوتی' اگر مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ موجود ہے تو مصنف کے نہ ہونے کے باوجود اس بات کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ کون سا ایڈیشن مستند ہے۔ اور کس میں مصنف کے علم اور اجازت کے

بغیر اضافہ کیا گیا ہے۔

مسودات و مخطوطات کو جو اہل علم ایڈٹ کرتے ہیں' ان کو زیادہ دشواری اس بناء پر پیش آتی ہے کہ مسودہ مصنف کا لکھا ہوا نہیں ہوتا' اس کے ناقل دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک ہی کتاب کے ایک سے زائد نسخے ہونے کی صورت میں ان کے درمیان تقابل اور موازنہ ضروری ہو جاتا ہے۔ وہاں مدیر و محقق صرف اتنی وضاحت کرتا ہے کہ فلاں نسخے میں فلاح عبارت اس طرح پائی گئی اور فلاں نسخے میں اس طرح۔ لیکن اس کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہوتی جس کی بناء پر وہ کہہ سکے کہ فلاں عبارت حتمی طور پر مصنف کی ہے اور فلاں عبارت تحریف شدہ ہے۔

میں صرف ایک مثال دوں گا۔ امام مالک بن انس (م۔۱۷۹ھ) کا مرتبہ مجموعہ احادیث' جس میں ان کی فقہی آراء اور اجتہادات بھی ہیں' ان کے شاگردوں کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے سولہ نسخے معروف و متداول ہوئے لیکن ان سب میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔

حضرت پیر سید علی ہجویری رحمہ اللہ علیہ (م ۴۶۵ھ) کی کتاب کشف المحجوب کی صورت حال بھی کچھ اسی طرح ہے' اس کے تین نسخوں کو مستند مانا گیا۔ نسخہ لاہور' نسخہ تہران' اور نسخہ ماسکو۔ مگر ان تینوں میں متعدد مقامات پر فرق ہے۔

مصنف کا اپنا مسودہ اگر محفوظ ہو تو کسی محقق و مدیر کو تقابل کی زحمت نہ ہو۔

مصنف کا مسودہ محفوظ و موجود ہونے سے یہ بھی فائدہ ہو گا کہ اس کی تاریخ تالیف اور عرصہ کا تعین ہو جائے گا۔ عام طور پر مصنف' مسودے کے آخر میں تاریخ درج کرتا ہے۔

اصل مسودے کے محفوظ ہونے کا ایک فائدہ اور بھی ہے' اور وہ یہ کہ بہت سے مسودات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی دوسرا صاحب علم نظرثانی کرتا ہے۔ عبارت اور مضمون کی اصلاح کرتا ہے' اور بسا اوقات وہ انتہائی اہم ہوتی ہے۔ اگر اصل مسودہ محفوظ ہو گا تو براہ راست مسودہ دیکھنے سے اس کی آگہی ہو گی کہ مولف کا کام کتنا ہے اور کس درجہ کا ہے' اور نظرثانی کرنے والے کی محنت کتنی ہے۔

چند سال پہلے ایک صاحب علم نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۔ ۱۱۷۶ھ) کی تصنیف البدور البازغہ کا اردو ترجمہ کیا۔ اس پر نظرثانی ہمارے ملک کے مشہور عالم' پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر' وفاقی شرعی عدالت کے جج مولانا عبدالقدوس قاسمی مرحوم نے کی۔ ناچیز راقم کو اس مسودے کی تدوین کا فرض سونپا گیا۔ میں نے وہ مسودہ لفظ بہ لفظ پڑھا۔ میں پوری دیانتداری سے یہ بات کہوں گا کہ نظرثانی ترجمہ سے کہیں زیادہ بہتر تھی' نظرثانی کے بغیر ترجمہ شائع کیا جاتا تو اتنی اہم کتاب کے ساتھ ظلم ہوتا۔

ملک کے معروف ادیب' شاعر اور صحافی شورش کاشمیری مرحوم کا مجموعہ کلام "گفتنی ناگفتنی" کے نام سے شائع ہوا۔ بہت سے احباب نے دیکھا ہو گا لیکن انہیں معلوم نہیں کہ وہ کن مراحل سے گزر کر ان تک پہنچا۔ میں ان تمام مراحل کا عینی گواہ ہوں۔ شورش مرحوم' شاعری میں احسان دانش مرحوم کے شاگرد تھے۔ بہت اچھے شاگرد۔ ایسے شاگرد جن پر استاد فخر کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا مجموعہ کلام مرتب کیا تو استاد محترم احسان دانش کی خدمت میں پیش کیا' ان سے اصلاح کی درخواست کی۔ احسان صاحب نے اس حد تک اصلاح کی کہ بعض نظموں اور غزلوں میں کئی اشعار اپنے شامل کر دیئے۔ گفتنی ناگفتنی میں ایک نظم ابوالکلام آزاد پر ہے۔ اس میں اصلاح کے علاوہ دو شعر احسان دانش کے ہیں۔ اگر گفتنی ناگفتنی کا اصل مسودہ محفوظ ہو تو دیکھنے والوں پر یہ راز کھلے کہ اس شعری مجموعے کے سنگھار میں کس کے قلم اور فکروفن کا کمال ہے۔

اس طرح کی بہت سی مثالیں میرے علم میں ہیں۔ اسی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اصل مسودے اور مخطوطے کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ طبع ہونے' نہ ہونے سے اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

یہی وجہ ہے کہ تالیفات کی نسبت ملفوظات کا درجہ استناد کم ہے۔ کیوں کہ وہ دوسروں کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں' ان میں کمی بیشی کا قوی امکان ہے۔ دانستہ بھی' نادانستہ بھی' عقیدت کی راہ سے بھی' سوء فہم اور خامئی علم کی وجہ سے بھی۔

اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے پر مبنی اس تحریر کی بنیاد پر چند باتیں عرض کروں گا کہ جن کی نوعیت تجاویز کی ہے۔ روئے سخن بطور خاص ادارہ تحقیقات اسلامی کی طرف' اور بالعموم اسلامی یونیورسٹی کی مرکزی اور دوسری متعلقہ لائبریریوں کی طرف ہے۔

۱۔ پہلی بات یا پہلی تجویز یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں گزشتہ سو' سوا سو برس میں دینی موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئیں' ان کے مسودات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جن اہل علم کے مسودات کے حصول کی کوشش کی جائے ان کا انتخاب کر لیا جائے۔ کیونکہ نہ سب کے مسودات کا حصول ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت و اہمیت۔

۲۔ ادارہ میں سیرت لائبریری موجود ہے۔ اگر تمام اسلامی موضوعات پر مسودات کا حصول ممکن نہیں تو کم از کم سیرت کے موضوع پر قابل ذکر اہل علم کی تصانیف کے مسودات جمع کئے جا سکتے ہیں۔

۳۔ ادارہ کی لائبریری میں جو مخطوطات اس وقت موجود ہیں ان کی جامع فہرست شائع کی جائے تاکہ ان اہل علم کی رہ نمائی ہو سکے' جو کسی مخطوطے کو ایڈٹ کرنے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔